

مصباح علی سید

# میر لاجِ دِلالہ

آپس میں ستم گستاہی بھنٹی شعاعیں زمین پر  
ایسے آری تھیں جیسے زمین پر افطاری کا سالن بجا ہو۔  
سڑک پر ہر چیز پکلی جا رہی تھی۔ سوائے عمرایا زکے اور  
اس جھلساتے موسم میں وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ ملی



مور، ہرن کی چال کا خوب تذکرہ سن رکھا ہو گا لیکن جناب! اس کی قطعاً ایسی چال نہیں تھی اور نہ ہی جیتے کی طرح بلکہ ہنر کھانے کے بعد سر ہٹ بھاگتے گدھے کے مشابہہ مزدور لگتا تھا۔

کچھ عرصہ سے اس میں ایک تبدیلی نمایاں تھی۔ چلتے چلتے جھک کر اپنی شلوار کا پانچھ ضرور چپک کرتا تھا۔ ایک دو بار ایسی حرکت آفس میں کئی قریب بیٹھے کو لیک نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا ہوا بھائی۔ خیر تو ہے، پیٹ ٹھیک ہے آپ کا۔“

اب وہ کیا بتائے کہ زندگی کی روانی میں اکثر بد رنگی بلکہ دورنگی جراثیم پسینے کا اتفاق تو اکثر ہوا ہو گا، لیکن شلوار کا انسایدھا ہونا، کس قدر شرمساری کا باعث بنتا ہے، یہ صرف عمر یا ذہنی جان سکتا ہے۔ اب بھی اس نے تیز چلتے چلتے کوئی تیسری بار جھک کر شلوار کا پانچھ دکھا تھا اور جھٹکا سر جھکی کے مجھے سے جا ٹکرایا۔

”اوہو۔ میرے ربا۔!“ اٹھا اور اٹھاتے اک کر اہ سی نکلی تھی۔ ایک تو یہ واپڑا بجلی تو دیتا نہیں لیکن ناجائز تجاوزات کی طرح جا بجا تاروں سے بھرے مجھے ٹھونک رکھے ہیں۔ کتنی دیر اس کی نگاہوں میں تارے اور کھٹکائیں ناچتی رہیں۔ گستاخی اچھا ہوتا ان کی جگہ حیا چمک جاتی۔ خیر اس نے ماتھے پر ابھرے آنسو کو رگڑا اور دس حرف پیچھے ان تمام کی زندگیوں پر جنہوں نے اس کی زندگی میں قیامت خیزیاں عمارتیں کیں۔ وہ آج کل بے حد پریشان تھا۔ اپنی زندگی میں کچھ سکون ڈھونڈنے کے لیے نکلا تو اس نے کبھی لیا تھا لیکن میں باپ کے بعد اس کو شدت سے چاہنے والے ساتوں بہن بھائیوں نے ان دیکھی قسم اٹھائی۔

”ٹوکی تو نے اپنی مرضی سے پسند کی، نکاح اپنی مرضی سے کیا، لیکن ہم نے بھی ماں باپ کو آخر منہ

دکھاتا ہے۔ چار لوگوں میں ہماری بھی کوئی عزت ہے۔ لوگ کیسا تھو تھو کر سن گئے، یمسکین بھائی نے خود ہی یہاں رہ چاہا اب رخصتی ہوگی اور خوب دھوم دھڑکے

سے ہوگی اور ہماری ہی مرضی سے ہوگی۔“ وہ جب ہو گیا تھا کیوں کہ حیا سے اس دن خاموش ملاقات سے تین چار دن بعد سب بہن بھائی اکٹھے ہو کر حیا کے گھر دھاوا بولنے گئے۔ سب نے دل کی خوب بھڑاس نکالی طعنے تشنہ دیے، ماں کی سوئی غیرت جگائی۔

”ٹوکی ایسی ہی بھاری تھی، مانا ہمارا بھائی گدھا ہے، تم ہانک کر ہی لے گئے۔“ بڑی تپانے چھوٹی کے کٹو ماری، تیسرے نمبر والی نے منہ چڑھایا۔

”پاگل مرنے کو برا نہیں کتنا ٹوکی کو کہہ۔“ پھٹی آیا بوٹی ”ایسے تو نکاح ہی نہیں ہوتا، توہ قیامت ہی ہے۔“

دونوں بھانوجوں نے اپنی اپنی بارات کے مہمان منہ دیے۔ بھائی جان نے جوش میں آکر کہا تھا۔ ”ہمارا بھائی شکل سے غریب لگتا ہے مگر بے نمبر اب ہم ڈھول باجے لائیں گے۔ تب ساتھ کرنا اچا لڑکی۔“

سسر کی غیرت تو ایسی جاگی کہ دھالیں ڈال ڈال دوا فٹ اچھلی کہ!

”بچو عمر ایذا! اب لا بارات اور سب بہن بھائیو! سے معافی منگوا، اگر حیا لے جاتی ہے،“ ایسے میں آیا بے چارہ بہن بھائیوں کو راضی کرنے میں لگا تھا۔



ان ظالم بہن بھائیوں سے کچھ رقم بجا کر بڑی مشکل سے بچت کی اور ایک موٹر سائیکل خرید لی تھی لیکن بس ٹائم کو اس کی تھی۔ ورنہ تو بھی بھائی جان۔ اڑتے کبھی بھیا اور اگر وہ دونوں اپنی سواریوں کو زحمت دے لیتے تو خیر سے بھانجے اب اتنے بڑے ہو چکے! کہ مانگتے ڈرانہ شراپے تھے انہیں جب بھی داؤدنگ کا شوق کسی بھوت کی طرح چڑھتا، سب پہلے ان کے ابا پانا موٹر سائیکل مرمت کے خرچے۔

خوف سے چھپا دیتے پھر ایسے میں ایاز ماہوں ہی اٹے ہستی تھی، آڑے وقت میں کامر آنے والی۔

”وہاں! مستری تک بانیک گھسنا تو جائے گا ہی“  
 وہ میرے بچے بھی بٹھالے، ٹٹلی کے گھر تک آدھرتا۔“  
 اسے آج بینک جلدی پہنچنا تھا کیوں کہ ان دنوں  
 بینک کی کلوزنگ شروع ہو چکی تھی۔ بانیک سے جانے  
 کا ارادہ ملتی کر جس اسٹاپ کی جانب چل پڑا اور سر  
 پھوڑنے کے لیے کھبا جانے کیوں درمیان میں آگیا۔  
 وہ ماتھا سلاتا بس میں سوار ہو چکا تھا۔ موبائل چیک  
 کرنے کے لیے نکالا۔ اس کا ان باکس بری طرح سے  
 پھٹنے والا تھا۔

”عمر یاز، عمر یاز، عمر یاز۔“ اور پھر بہت سے  
 سوالیہ نشانات نے موبائل بینک کر رکھا تھا۔ اس نے  
 کھول کر دیکھا۔ چوتھے نمبر والی باجی کے پیغامات تھے۔  
 وہ علویا! ایسی ہی تھیں۔ جس کام کا سرسری خیال آجاتا  
 ان کے حواسوں پر بے طرح حلوی ہو جاتا تھا۔ ان کی  
 ان ہی حرکتوں سے تنگ آکر ان کے میاں نے خود کو  
 مستقل ہائیپرکین کا مریض ظاہر کر رکھا تھا تاکہ کچھ دیر تو  
 بیگم کی زبان بند ہو۔

جب وہ مسیح کرنے سے تنگ آگئیں تو مس کل  
 پر مس کل دینا شروع کر دی۔ عمر یاز کو ہوتا تھا وہ کل پر  
 اپنا روپیہ تنک نہیں لگائیں گی سو اسی نے کل ملا لی۔  
 حسب عادت سنسنی پھیلا دینے والی یہ بہن کل  
 اٹھاتے ہی بدحواسوں کی طرح ہوتی تھی۔

”یاز! تجھے پتا ہے میں کل عتیق پھر مالک دکن کے  
 ساتھ پختایات کرنے گئے تھے۔“ ان دیکھے خوف سے  
 عمر یاز کی آنکھیں پھیل گئیں کیوں کہ معاملہ بہت  
 سیریس تھا۔ مالک دکن ان کے میاں سے دکن خالی  
 کرانے کے چکر میں تھا۔ جب کہ ایمپنمنٹ کی مدت  
 پوری ہو جانے کے بلوجو عتیق بھائی پرانے کرائے دار  
 ہونے کی دھونس پر کسی صورت دکن چھوڑنے پر  
 راضی نہ تھے اور وہ بھی ان دنوں جب عید کا سیزن  
 شروع ہونے والا ہو۔ روز جھگڑا ہو رہا تھا۔ قریبی  
 دکانداروں کو اکٹھا کر کالم گلوچ کے ساتھ بات دست  
 کر رہاں تک پہنچ جاتی۔ عمر یاز کو اچھی طرح یاد تھا۔

یوں کاروبار کر بانیک سائنکسل۔ آکر تو وہ دے دیتے  
 تو ان کی دس نسلوں میں بیٹے پیدا ہونے جیسی  
 مامیں دیتے اور اگر کبھی ڈپٹ کر انکار کر دیتے آف پھر  
 نہ پوچھو کیوں کہ ماموں بھی ایسے ہی واقع ہوئے تھے  
 اپنے ساتھ بہن بھائیوں کے سامنے ہتھ کڑی لگے  
 بزم کی طرح گردن گرائے جلتے تھے ان کے بچوں کے  
 سامنے سائوے چہرے کو ہولناک بنانے کے لیے چکی  
 ہلوں والی آنکھوں کو پھاڑ لیتے، سوکھی غنمی جیسی  
 بیاباں تین کر ڈانٹنا شروع بڑی بھانجی اس قدر بدتمیز  
 تھی ڈرتا تو درکنار اپنی انگلی سے ان کی پسلیاں گھسنے لگ  
 بائی اور کہتی۔

”ماموں کچھ ذمہ لی کریں، یہ والی اکڑ کر ٹوٹنے والی  
 ہے۔“ پھر کیا، سب بچوں کے قہقہے چھوٹ جاتے  
 تھیں مارتے، خود بھی ہنسنے اپنی الموں کو بھی ہنساتے۔  
 انے میں ماموں آگے پیچھے ہو جاتے اور جس کام  
 پر تلش آیا تھا۔ وہ واقعی نہ کرتے تھے بھانجے کون سا  
 کٹنے والے تھے۔ جب جب ماموں نے موٹر سائیکل  
 اپنے سے انکار کیا انہوں نے خاموشی سے جاتے جاتے  
 دیوڑھی میں کھڑی بانیک کے ہاتھ پر کیل گاڑ دیا یا تیل کا  
 باپ کھینچ گئے۔

”چلو ہمارے کام کی نہیں تو کم از کم ایک دن ملا بھی  
 اسے گدھے کی طرح گھسنا مستری تنک لے جائے  
 گا۔“

رات بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا بلو بانیک ماننے  
 آیا۔ ماموں نے صبح جلدی جانے کا کہہ کر انکار کر دیا۔  
 وہ کہہ نہ صفت جاتے جاتے پلنگ کی تار کھینچ کر کاغذ  
 اڑس کر واپس لگا گیا۔

”چل پھر اسے صبح لکھیں ہی مارتا رہیں۔ نہ  
 اپنے کی کچھ تو سزا ملے۔“ اور صبح جب اس نے لگ  
 داری تو وہ اشارت نہ ہو کر دسے زیادہ شور اس لیے نہ  
 اٹا کہ چھوٹی بھابھی کی لٹش ہنسن تیار یوں سے لگتا تھا  
 لے جانے کی تیاریوں میں ہیں۔ اگر بھیا کو ہتا چل گیا تو  
 انا تھل کہہ دیں گے۔



دن پہلے عتیق بھائی کہہ رہے تھے۔  
 ”اس کے باپ کا راج ہے، خلی کروا کے تو کھائے“  
 میں (گلی) اسے گولی بارودوں گا۔“ اس جھماکے کے  
 ساتھ ہی اماں کو اپنی سانس ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی تھی،  
 کہیں بھائی نے ایسا کر تو نہیں دیا۔“ اس نے بہت  
 ساری بہت بھتیج کر کے پوچھا تھا۔

”بائی خیریت تو ہے۔ عتیق بھائی گھر ہی ہیں؟“  
 ”ہاں۔۔۔!!!“ بائی کے بھنے گلے اور بندناک سے  
 نکلتی ایسہ نلس جیسی ”آں“ پر وہ اندر تک کھس گیا۔  
 اس کاشت سے جی چاہا کہ بائی کے گلے اور بندناک  
 میں اتنی روٹی ٹھونس دے کہ ہمیشہ کے لیے ”تس“ بند  
 ہو جائے اور کم از کم ایسی خطرناک باتیں سننے کو تو نہ  
 ملیں جن سے دھچکے ہوئے جسم کا بجا ماندہ خون بھی پھڑ  
 جاتا ہو۔ اس نے رخ ٹھونٹ ٹھونٹ کر آہستگی سے پوچھا۔  
 ”پھر مسئلہ کیا ہے؟“

”کیا مسئلہ ہو نا۔“ تاجمل عارفانہ۔ ”کیٹی کے  
 میے جوڑ رکھے ہیں تو بیک جاتے ہوئے۔“ اتورا تپا کی  
 طرف پکڑا تا جا۔“ ساتھ ہی وہ اونچی آواز میں  
 برید میں۔ ”ایک تو تپا بھی قسم سے ایسی ہیں، کیٹی  
 ایک دن لپٹ ہو جائے تو سو رہے جرمانہ لگاوتی ہیں،  
 مجھے پورا یقین ہے اپنی کیٹی تو یوں ہی ٹھک جاتی ہوں  
 گی۔“ چلا کو۔ ”اللہ بخشنے امل کما کرتی تھیں بڑی  
 پھوپھی پر کبھی ہیں تپا۔“ اس سے پیشتر کہ وہ مزید تپا  
 کے ٹھٹھنے کے اونچے جھکنڈے بتاتیں وہ جلدی سے بولا  
 تھا۔

”بائی! میں تو آج بس پر جا رہا ہوں۔ کل۔۔۔“  
 ”ہاں ہاں بس۔“ اس کی بات درمیان میں کاٹ  
 دی۔ ”میں جب بھی کوئی کام کہہ دوں تو توڑھکا چھپا انکار  
 کر دیا کر صاف کہہ دے میرا کام کرتے موت پڑتی  
 ہے۔ تپا کے اسکول کا تو چوکیدار تک بن جاتا ہے۔  
 بھائی جان کے گھر کا محراب دھوئے میں نے اپنی آنکھوں  
 سے دیکھا ہے مجھے ہر کسی کے آگے پیچھے ہٹیں کرتا  
 پھرتا ہے، تیری رخصتی کروادیں، میری دفعہ انکار ہے۔  
 اچھا بس ٹھیک ہے۔“ وہی ان کا لٹھ مار انداز عود کر

آیا۔ ”بھو اڑوں گی، کسی اور کی منتیں کر کے تو اپنا قیمتی  
 وقت اپنے پاس رکھ، اپنی اس جیا، بے جیا کے لیے  
 بچا کر۔“ وہ ابھی مزید صلواتیں سناتیں لیکن وہ عاجزی  
 سے بولا تھا۔  
 ”آپ ناراض نہ ہوں، میں واپسی پر آپ کی طرف  
 آ جاؤں گا۔“

”اے۔۔۔ میرا بھائی کتنا اچھا ہے تو۔“ وہ کھڑے پیر  
 بدل گئیں۔ ”اللہ تیری زندگی رکھے، صحت تندرستی  
 دے، تیری دے، خوشیوں دکھائے تجی کیا بتاؤں تجھے  
 اماں! کتنی مشکلوں سے میے جوڑے ہیں۔ اب اگر عتیق  
 دھچکے لیں، یقین کر فوراً ٹانگ لیں گے، مانتے تو انہیں  
 کبھی شرم آئی ہی نہیں، پالہ دے کر جوک میں بیچ  
 دوں، شام تک ہزار دو ہزار جمع کر لائیں گے۔“  
 مسافروں کے خوف سے اماں نے بمشکل ہنسی روکی مگر وہ  
 پوری سنجیدگی سے اپنا دونا دہی تھیں۔

”پیروں کا تو انہیں ہر وقت دونا پڑا رہتا ہے، آج  
 کل تو ویسے ہی دکن کی طرف سے جیلے پڑے ہیں۔  
 اظہار میں بھی کہتے ہیں روزہ رکھ لو۔ لے تپا، اب تو  
 تیری شادی پر بچوں کے میے جوڑے بھی تو بنوانے  
 ہیں، تجھے بھی کچھ دنا دلانا ہو گا، ورنہ تیری وہ جیا۔“  
 اب کے بے جیا انہوں نے دل میں کہا تھا ”جینے دے  
 گی بھلا۔“ عمر اماں چپ کر کے سنا رہا۔ ”اچھا پھر بتا  
 آئے گا ناں تو۔ میں انتظار کروں گی۔“

”جی آ جاؤں گا۔“ یہ صرف عمر اماں جانتا تھا کس دل  
 سے اس نے اچھا جی کہا تھا۔



بس اسٹاپ پر رکی، بائی بینک تک کا راستہ اس نے  
 پیدل طے کیا تھا۔ خیالوں میں بار بار جیا کے باجیا  
 جھلکے روزے کی شدت اور بائی کی خود غرضی کٹتی حد  
 تک کم کر چکے تھے۔ بینک میں سارا وقت بے حد  
 مصروفیت کا گزرا، چھٹی سے کچھ پہلے جیا کا مسیج  
 آیا۔

”مگر آپ فری ہیں تو آفس کے فون سے کل

ایک دوسرے کے بل فونچ فونچ ٹنڈ کر دیں۔  
 ”اچھا ہے نا بھابھی۔“ پھولی والی نے مستی میں بڑی  
 والی کو ٹھوکار مارا ”جوئی نہیں اور بیٹ خرید رکھے ہیں۔  
 بالوں میں انکائے کو، کیلوں سے ٹنڈ پر ٹھونکیں گی برات  
 پر ہی ہی ہی۔“

پھر ٹنڈ پر ٹھونکیں پنوں کی لطافت نے موسم کی  
 حدت کو قدرے کم کر دیا تھا۔ ننوں اور ان کے بچوں  
 لعنتیں بھیج اپنے اپنے مہمانوں کی لسٹ عمریاز کو  
 پکڑائی۔ ایاز بھی ایسے میں کیا کرتا کسی بہن بھائی  
 بھلوج کو ناراض کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔  
 کیوں کہ صورت حال خاصی تشویش ناک ہو چکی تھی۔  
 سر صاحب نے ضد پکڑ رکھی تھی۔

”جب تک تیرے بہن بھائی راضی خوشی نہ آئیں  
 گئے، جیائیں دل لگے۔“

اب بہن بھائیوں کو راضی خوشی کرنے میں بیچارہ  
 خود محلے کے بھنگی خوش بخت سے ملنے لگ گیا تھا۔  
 بینک میں بیٹھا وہ بھنگی تمام سرسٹیں چرے پر  
 سجائے خیالوں میں جیا کے لیوں سے سرخ پھول  
 جھڑتے دیکھ رہا تھا۔ آواز میں تمام نری اتار کر بولا تھا۔  
 ”کیا فراری تمہیں آپ۔“

”کیا بات ہے روزے میں آپ کے کھانوں نے کالم  
 کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ وہ صرف مسکرایا۔  
 ”میں کہہ رہی تھی اب ای بھی ناراض ہو رہی ہیں،  
 بتلا دیجئے آخر خفا کیوں ہیں۔“

”ارے نہیں نہیں، کیسی باتیں کرتیں ہیں آپ  
 میں اور آپ سے خفا۔ ان شاء اللہ آج شام کو سر کے  
 بل حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس کے جیلے پر جیانے جاندار  
 قہقہہ مارا۔ ایاز کے دل میں جلتے تک گھٹیلے بن گئیں۔  
 سانولا رنگ گرم تانبے کی طرح جل رہے لگا۔

”خدارا“ سر کے بل مت آئیے گا، لوگ مداری  
 سمجھ کر رستہ نہ دیں گے، اور افطار کا وقت کرتب  
 دکھانے میں گزر جائے گا۔“ اس کی حس مزاج پر کنوڑ  
 دل میں چوہے بلیاں دھاچ کر ڈی چانے لگے۔ ”اللہ  
 حافظ“ کہتے ہوئے فون بند کیا۔ ”پناہست خیال رکھیے

لر لیں۔“ حیا کے لیے تو عمریاز دل و جان سے فری  
 قنا۔ اک نظر دیکھنے کے لیے بے چین، آواز سننے کے  
 لیے بے تاب۔ ”اپنے بے قرار دل کو قرار دینے کے  
 لیے آفس کا فون کیوں اپنا برسل استعمال کرے گا بھلا  
 وہ صرف بہن بھائیوں کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے ہی  
 تھوڑا جب میں ڈال رکھا ہے۔ اس نے فوراً کل  
 مائی۔ سوکھی پسیلیوں میں دھڑ دھڑ دھڑکتے دل کے  
 ساتھ اس کا دل احوال پوچھا۔

”خیریت جی جی، کیسی ہیں آپ؟“  
 ”میں تو اللہ کی کرم نوازی سے بالکل ٹھیک ہوں،  
 بس آپ ہی کے مزاج میں ملتا۔“  
 ”ارے یہ کیا کہہ دیا آپ نے حکم کریں  
 آپ۔“

وہ قدرے اٹھلاتی پھر دبا دبا سا غصہ کرتی، کہنے لگی۔  
 ”ای کب سے آپ کو افطار پر بلاری ہیں، آپ ٹالے  
 ہی جا رہے ہیں۔ کل تیرا غشو بھی شروع ہو جائے  
 گا۔ مگر آپ ہیں کہ۔“ سنتے ہی ایک غمزہ تو  
 بلیوں میں انگ گئی۔ دراصل اس کی سانس نے اسے  
 کئی بار افطار کے لیے فون کیے مگر قسمت کے چکر ایسے  
 تھے سوخت تو اس کے پاس تھا مگر صرف بہن بھائیوں  
 کے کھلے دھڑکنے کے لیے۔ کتنی بار ارادہ کیا، مگر کبھی  
 نہ آ کوئی پن گیا، کبھی لباس، کبھی ہانک عتاب ہے تو  
 کبھی سارے بہن بھائیوں کا اجلاس بیٹھ جاتا۔ مسئلہ  
 عمریاز کی شادی کا معاملہ دیکھنے کا تھا۔ اور اجلاس بھی  
 ایسا تھا جس میں ان ساتوں کے اکیس بد تمیز بچوں پر عمر  
 ایاز کی ڈوبتی ہوئی تھی۔

”وہ بیان رکھ ٹریس پڑھیں نہ۔“ کیوں کہ بہنوں کو  
 اٹھتے ہوتے ہی سرسٹل کے رونے، رونے کا موقع ملتا  
 اور بھابھیاں اس رش کو دیکھ کر اندر تک جلتی  
 بھستیں۔ آگے پیچھے کتنی بار دونوں بھابھیوں کو کھسر  
 پھسر کرتے سنا گیا تھا۔

”جس دن گرمی زیادہ ہو جائے مگر کے کاموں سے  
 ہی لڑ، کم بختیں آجاتی ہیں انہی ہو کر، بھائی کی بری  
 بان کرنے۔ کو لڑ کے آگے اچھی بڑی ہیں، خواہ بچے

سب لہل کے ساتھ تھیں۔ اور پھر لا آرائے سالوں میں جہاں ہر جہہ نا کام کیا تھا لہل کی ناراضی رنگ لے آئی۔

عافین حسن مان کیا تھا شادی کے لیے۔ لہل بیٹیوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اور عافین حسن کو ٹھکانہ نہیں مل رہا تھا جہاں وہ اپنے دل کی تمام لڑائی اور دیرانی نکال کر رکھ دیتا۔



”سعدیہ کی نند کا دہور ہے نا حسیب۔ وہی جو کارڈیو لو جھٹ ہے۔ پانچ سال شادی رہی۔ اولاد نہ ہوئی۔ بیوی بھی فوت ہو گئی۔ دو سال ہو گئے اسے دنیا سے گئے پہلے تو شادی کے لیے ہانا نہیں تھا۔ اب مان گیا ہے اور اس نے خود گھر والوں سے کہا ہے کہ تمہارے لیے بات کریں۔ شادی کے بعد انگلینڈ شفٹ ہونے کا ارادہ ہے اس کا۔ اگر تمہیں جاو تو رشتہ سمجھ میں آتا ہے۔ میں ملی ہوں اس سے کئی بار بہت اچھا منڈب ہے۔ عمول میں بھی تم دونوں کے زیادہ فرق نہیں۔ مناسب رشتہ ہے سوچ لو بیٹا۔“ آئرن اسٹینڈ کے سامنے کھڑی قاریہ نے لہل کی پوری بات سنی۔ پھر محل سے بولی۔

”لہل! آج سے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔ تو نہیں کرنی۔ اور ضروری نہیں ہے لہل شادی کرے۔ میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں اور میں شادی کے بغیر اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔“

”دیکھو قاریہ! اب تو بیویہ کے رشتے بھی آنے شروع ہو گئے مگر میں تمہاری شادی پہلے کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی زندگی اچھی گزر رہی ہے۔ مگر کچھ سال گزریں گے تو بچہ ستو کی۔ ٹھیک ہے ہم سرور زگار ہو کسی کی محتاج نہیں ہو۔ مگر تم عورت ذات ہو قاریہ! سر پہ باپ نہیں رہا۔ کوئی بھائی نہیں ہے۔ اور عورت جتنی بھی اسٹوگ اور با اثر ہو اس معاشرے میں بلو قار زندگی کے لیے اس کے نام کے آگے کسی مو کا نام ہونا ضروری ہے۔ ایسا مود جو اس زندگی میں اس کا ساتیان ہو۔

اعلم سے کہ۔

”فرح کھاٹہ میں رہو۔ بیٹوں کے لیے ایسے بے دھڑک ہو کہ بات نہیں کرتے۔“ بیٹی خالہ نے ڈانٹ دیا مگر جھوٹی فرح کے ساتھ تھیں۔

اگلے دو سالوں میں وہ بینک میں منجری کی پوسٹ پر آ گیا۔ معیار زندگی میں بھی تبدیلی آئی۔ اب یہ گھر بھی بچہ کر انہوں نے مزید بڑا گھر لیا۔ تقریباً ڈیڑھ کنل پر مشتمل یہ بنگلہ ان سب کی خواہشوں سے بڑھ کر تھا۔ خاندان بھر میں اس کی تعریف ہوتی تھی۔ کئی بیٹیوں والے خود منہ سے رشتہ دے رہے تھے۔ امیر گھرانوں سے بھی رشتے آرہے تھے۔ مگر اس کی ”نہ“ اپنی جگہ برقرار تھی۔

اتنا بڑا گھر۔ لہل بولائی بولائی پھر تھیں۔ جاگتی آنکھوں سے پوتے پوتیوں کے خواب دیکھتیں۔ ان کے لیے ابھی سے گھر میں جھولے لگوا رہی تھیں۔ مگر حقیقت میں درودر مکان کا آنا پنا نہیں تھا۔ بیٹیوں کو بلاتیں اور خوب سخت ستانٹیں۔

”کیسی بچیں ہو ایک بھائی۔ شادی کے لیے رضامند نہیں کر سکتیں۔ بس اپنے اپنے گھروں کی فکر ہے۔ بھائی کی پرواہ نہیں اس کی زندگی میں بھی روتی آجائے۔ کتنی حسرت ہے مجھے اس کے بچوں کے لاڈ اٹھانے کی۔“

”لہل! ہم تو ہر طرح بھائی کو قائل کرتے رہے اب وہی نہ مانے تو ہم کیا روستی کر سکتے ہیں؟“

”آپ میں ہو کے زبردستی نہیں کر سکتیں ہم تو پھر نہیں ہیں۔“ درمیان والی سدھ نے کہا۔

”اچھا یہ بات ہے تو اب میں بھی بتاتی ہوں تم لوگوں کو۔ میرا بیٹا میں کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ اب ہو گا دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ اب میں اسے جوان بنانا سمجھ کر منتیں نہیں کروں گی بلکہ ایسی ناراضی دکھاؤں گی کہ چھوٹے بچے کی طرح مجھے منائے گا اور دیکھتی رہو تم لوگ ہمیں عید پر تم لوگوں کی بھابھی ضرور ہو گی۔ نہیں تو ہم میں کوئی عید نہیں منائے گا یہ طے کر لو۔“ لہل نے اس دن پکا تہیہ کر لیا اور بیٹیوں کو بھی بلور کر دیا۔



اے! میں اپنی ذات کے ساتھ خوش ہوں۔ اگر مجھے لگا کہ میری ذات کسی ساتھی کی ضرورت مند ہے تو میں ضرور شادی کر لوں گی۔ بس آپ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ دم لہجے میں بول رہی تھی۔  
اے! نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔



تینو سال بیت گئے تھے۔ تینو سالوں میں حالات بدلے اور بہت کچھ بدلا۔ مگر اس کے دل پہ اداسی اور یادوں کا موسم ٹھہر سا گیا تھا۔  
یہ بات سچ تھی کہ اے! نے نہ کوئی شکوہ تھا نہ شکایت۔ نہ ہی وہ کبھی اس وجہ سے اے! سے خائف ہوئی تھی کہ عافین سے پھرنے کا موجب اے! ہی

تھیں۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس کے دل میں عافین کی محبت اس کی یادوں زلزل کی طرح تازہ دم تھی۔ تینو سالوں میں اس کے بارے میں اک ذرا سی خبر بھی نہیں ملی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اسے بھول گیا یا کبھی کبھار یاد کر لیتا ہے۔ مگر سال یا آج تک اسی عہد سے بندھا ہے۔ اس کی طرح اکیلا ہے۔ کچھ خبر نہیں تھی اس کے بارے میں پھر بھی۔ وہ اسی کی یادوں سے اپنے اندر کی دنیا آبلو کیے ہوئے تھی اور انتظار میں تھی۔ یہ انتظار لا حاصل تھا یا اس کا کچھ حاصل تھا؟ وہ اس بات سے بے پروا تھی۔ اسے تو جانتے سے کا منتظر یا تھا۔

وہ بچوں سے کچھ نہیں بولا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں کہہ گئی تھیں کہ کبھی نہ کبھی اسی کی طرف بٹے گا اور وہ آج تک ان نگاہوں کے عہد سے بندھی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے پلٹ آنے کی امید دل میں پوری توانائی سے زندہ تھی۔ فاریہ کو اللہ سے امید تھی۔ اللہ پر یقین تھا اسی لیے تو اس کی امید نے کبھی دم نہیں توڑا تھا۔



تمہنوں کا خیال رکھتی ہو۔ بھانجے بھانجیوں کو تم سے انسیت ہے۔ مگر یہ رشتے جتنے بھی اچھے ہوں زندگی کے ساتھی کا کردار نہیں بھٹا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کا جوڑ دیا ہے۔ کوئی حکمت ہے تو دیا ہے۔ تا۔ دیکھ میری بچی! اپنی ضد چھوڑ اور عقل سے فیصلہ کر۔“ اے! کے لہجے میں پیار بھری منت تھی۔  
”اے! یہ باتیں آپ کئی بار کہہ چکی ہیں۔ کبھی اثر نہیں ہوا مجھ پر تو پھر کیوں ہر بار نئے سرے سے دہرائی ہیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ مجھے کسی ساتھی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اب نادبہ کے بارے میں سوچیں۔“ وہ کچھ بے زاری سے بولی۔ ہر بات آرام پارے کرنے والی فاریہ شادی کے ذکر پر یونہی چڑی جاتی تھی۔

”تم آج تک اس بات کو بھولی نہیں ہو فاریہ۔ اے! سے بدلہ لے رہی ہو تا۔ میں نے اس وقت تمہارے ارمانوں، تمہارے خوابوں، تمہارے دل کی پرواہ نہیں کی اور تم آج تک۔“ وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پائیں۔ فاریہ استری چھوڑ کر لپک کر ان کے قریب آ گئی۔

”اے! آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں۔ کوئی بیٹی اے! سے بھی بدلہ لے سکتی ہے۔ میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اے! باپ کا حق ہو تا ہے اولاد پر۔ اور اے! باپ جو جانتے ہیں، سمجھتے ہیں۔ ضروری نہیں وہ سب اولاد بھی سمجھے۔ آپ نے میرے ساتھ کچھ برا نہیں کیا اے!۔ بلکہ اچھا ہی کیا۔ ایک اے! اپنی بیٹی کو کسی بھی طرح سبھانے کا حق رکھتی ہے۔ کیونکہ اے! کبھی برا نہیں چاہتی۔ اور میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ آپ نے کبھی میرا برا نہیں چاہا۔ نہ برا کیا۔ جو ان بیٹی کسی غیر مو سے پیار کا رشتہ جوڑ دیتے تو اچھی اور سمجھ دار اے! اسے ایسے ہی سمجھائے گی۔

اے! ہونے کے ناتے آپ نے ٹھیک کیا تھا۔ اگر آپ میری شادی کا بھوت سر سے اتار دیں تو آپ کو بالکل نہ لگے کہ میں آپ سے بدلہ لے رہی ہوں۔

تیرے لیے آلو بخارے کا شربت بنا کر رکھوں گی! افطار میں چٹا ٹھنڈک ملے گی۔ کیسا کھلا گیا میرا بھائی۔“ کہتے ہوئے آئے کمرے کی جانب بڑھیں۔ کچھ دیر بعد ہزار ہزار کے نیلے نوٹ گنتی ہوئی آئیں اور ساتھ اسے کہہ بھی رہی تھیں۔

”ایاز! جب تم کو یہ دینے جائے گا، ان سے ان کا عید والا سوٹ لے لیا، کل جب تو شربت لینے آئے گا میری طرف تو وہ بھی لیتے آتا، میں سوچ رہی ہوں تیری رخصتی پر ویسا ہی ڈیزائن بنالوں۔ تیا بتا رہی تھی کہ نیا ڈیزائن بنوایا ہے انہوں نے۔“ پہلے تو لفظ ”تیری رخصتی“ بر منہ کڑوا ہوا، پھر آلو بخارے کے شربت کی مہمانی نے ٹھنڈک کی جگہ آگ بھڑی، وہ بولا تو کچھ نہیں بے چارگی سے دھماکا رہا۔ باجی نے نوٹ گمن کر اس کی جانب بڑھائے اور ساتھ تنبیہ بھی کی۔

”بے سامنے تبا سے گھونٹا، پورے دس ہزار ہیں۔ کسیں کہہ دیں، آٹھ تھے، پانچ تھے۔ بس اب کیا بتاؤں تیا کی ڈنڈی مار علوت کا۔“ عمر ایاز ان کی باتوں سے اندر تک جل بھٹن گیا تھا۔ اگر منہ سے ایک حرف بھی بول دیتا تو وہ ایسے ایسے راز اظہار کیا کہ بندہ اپنے آپ سے شرمایا جائے۔ اس نے بنا کچھ کئے، ہاتھ آگے بڑھایا، رقم جیب میں اڑتے ہوئے نکلنے کی جلدی کی۔ لمبے بعد ہی باجی نے کئی آوازیں دیں۔

”ایاز بات سن، ایاز، ایاز۔“ اس نے تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہر توازن سنی سنی کر دی۔ اور کھلی کانکڑ پار کر لیا۔



وہ تیزی سے بس سے اترا، تبا کے گھر کی جانب بڑھ رہا تھا کہ جلدی سے تبا کے پینے، پھرتیار ہو اور پھر حیا کے گھر جائے۔ آدھے راستے میں اسے تانہ آلو بخاروں سے سجی ریزمی دکھائی دی۔ ان واحد میں حیا یاد آئی۔ افطار پر اس کی جانب جانا تو تھا ہی، خالی ہاتھ جانے سے بہتر ہے کوئی فروٹ لے لیا جائے۔ اس نے اچھے اچھے آلو بخارے چھانٹ کر وزن کر لیا۔ رقم ادا

کرنے کے لیے اناؤالٹ نکالا۔ پیسے گنتے ہوئے اسے باجی کی کمیٹی کا مکمل گزرا۔ وجہ میں نہیں تھی۔ اس نے اچھی طرح جیب ٹٹولی۔ آگے کی پیچھے کی۔ سب کچھ تھا مگر کمیٹی غائب۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر ریزمی والے نے بھی پوچھا۔

”وہ بھائی کیا ہوا۔؟“

”کچھ نہیں۔“ کہیں کے آلو بخارے، کہیں کی افطاری اسے تو کمیٹی کی بڑگئی تھی۔ باجی ایسی تو نہ تھیں وہ اسے آسانی سے بخش دیتیں۔ سنتے ہی انہیں تو غش پڑ جاتا تھا۔ اکثر پوشتروہ اپنی نام نہاد غرت کے ایسے قصے سناتی تھیں کہ سننے والا انہیں چپ کروانے کے لیے اپنی جیب سے رقم نکل کر تھماتا تھا۔

”بس تو اپنا پورا کر لے، ہماری خیر ہے۔“ اب تو یہ دس ہزار کی کمیٹی کا معاملہ تھا، اگر محکم بھی پڑ گئی۔ وہ تو آگلی سال نہیں لیں گی۔ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ رخصتی سر پر ہے۔ پریشانی کے عالم میں وہ اپنے قدموں مڑا۔ ریزمی والا بھی روزے سے تھا۔ چلا کر بولا۔

”کم بخت تو چھانٹ تو ایسے رہا تھا۔ جیسے کسی وزیر اعظم کو پیش کرتے ہیں، پیسے سننے ہی دم نکل گیا۔“ اس نے اپنا شاہر دوبارہ ریزمی پر الٹ لیا تھا۔ وہ گردن جھکائے دوبار سارے رستے پر چلا تھا۔ کہیں رقم گری ہوئی مل جائے، اگر وہ وہاں گری ہوتی تب بھی نہ ملتی، کوئی راہ گیر اٹھا کر چلتا تھا۔ اس نے صدمے میں سارا وقت گزرا، آگلی صبح اپنی تنخواہ سے تبا کو کمیٹی بتا بتائے بھڑی۔ اگلے دن بینک میں بیٹھا تھا جب باجی کا کئی بار

مسج آیا۔

”ایاز! تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے بالکل توجہ نہیں دی، ان کا پہلا ضروری کام دس ہزار میں بھگتا تھا۔ مزید اس میں ہمت نہیں تھی۔ لیکن پھر باجی کی کل ہی آگئی۔ جانے کس حاتم طائی کا بچا کھالہ تھا۔ آج وہ مسئلہ کل کے بجائے باقاعدہ فون کر رہی تھیں۔ اس نے اٹھائی لیا۔

”جی۔ باجی۔“



”توبہ ہے کل سے تجھے مسیح کر رہی ہوں، مجھل ہے جو جواب دے دے۔ وہ کہتی۔“ وہ درمیان میں بات کاٹ کر تنگ کر بولا۔

ہاں ہاں دے آیا ہوں۔ پورے دس ہزار تھے۔ تپا کو اپنے سامنے کھائے تھے۔“

”آئیں۔“ بائی کے بند ناک سے ہوٹر بجلا۔ سچ بتا تو دے آیا۔“

”کیا اب لکھ کر دوں۔“ وہ چڑی ہو گیا۔ پورے دس ہزار کا صدر تھا۔

”جل پھر ٹھیک ہے بھیا۔“ بائی نو معنی کتے زور سے نہیں۔ ”کل تیرے جانے کے بعد اللہ کی زمین سے مجھے دس ہزار ملے تھے۔“ سننے ہوئے خوشی سے ایاز کی آنکھیں پھٹ گئیں لیکن بائی کے اگلے جملے نے اُٹک لگادی تھی۔

”کھیتی تو اب تو نے بھر ہی دی، ان دس ہزار کے تیری شادی پر اچھے سے جوڑے بنواؤں گی، ویسے تو“ تجھ بخوس نے دیئے نہیں تھے، اللہ نے ہی تیری جیب سے گردا دیئے۔“

کہتے ہی لٹناک سے بائی کا فون بند ہو گیا اور کتنی دیر وہ بند فون پر بائی کو کوستا رہا۔

\*\*\*

آج اس کا پکا ارادہ تھا انظار حیا کے گھر پر کرے گا۔ بلکہ اچانک جا کر انہیں سر پر انزو دے کر خوش کر دے گا۔ تیار ہونے کے لیے گھر کے راستے پر تھا جب بڑی آیا کی کل آئی۔ لمبے بھر کو اس کا دل مٹھی میں سمٹ گیا۔ دو چار دماغ میں بڑھ کر فون پر پھونکیں۔ آگے کون سا اس کی دعا میں قبول ہوئی تھیں۔ اوپر جانے سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی بن بھائی ہاتھ بڑھا کر اپنی جیب میں ڈال لیتا تھا کہ ابھی مناسب وقت نہیں۔ عمر ایاز تو بچہ ہے۔ ایسے ہی مانگتا رہتا ہے۔ اس نے بدلی سے فون کان سے لگایا تھا۔

”ہاں ایاز، کہاں ہے تو۔“

”گھر جا رہا ہوں، شہہ بابا بولا۔“

”جل میرا بچہ، جلدی سے میری طرف آ جا۔ ایک کلام آن پڑا ہے تجھ سے۔“ اس کی سادہ آنکھیں پوری طرح روشن ہو گئیں۔ تپا لگی لپٹی رکھنے والوں میں سے نہیں تھیں۔ نہ بھی منٹنا میں نہ تمید باندھی۔ جو کاہ ہے صاف زور دے کر کہہ دیا۔

”یہ تجھے ہی کرنا ہے، اگر نہیں کرنا، ابھی کہ ابھی بتا دے۔“ پھر بھلا عمر ایاز کی جرات تھی کہ کچھ بول پاتا۔ بس سر ہلاتا ”جی جی۔ ضرور“ کہے جاتا۔ اب بھی بے دلی سے مسکرا کر دروازہ بجایا۔ تپا نے ہی کھولا تھا۔ ساتھ ہی اندر لے گئیں۔

”آ جا بیٹھ جا۔“ ایاز کو لڑکے آگے اس کی کرسی رکھ دی۔ قریب ہی کھانے کی میز پر کچھ سالن بندھا تھا۔ ایک ٹفن، چھوٹا سا پانی کا کولر، ایک شہر میں تولیہ جائے نماز، چادر، جھانک رہی تھی۔ عمر ایاز کو کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ تپا نے ایک کرسی چھپتی اور اس کے سامنے رکھی۔ گری اس قدر تھی کہ کٹے میں دوڑا پڑا کھینچ کر بیٹھ پر چٹا اور ٹائلیں لمبی کرتے ہوئے بیڈ کی پائنتی پر نکالیں۔

”کیا قیامت بچاتی گری ہے۔ توبہ۔“ منہ پر ہاتھ پھیر کر کہتے ہوئے پوچھا۔ اور گویا ہو میں۔

”بلو تیرا کتنی دیر انتظار کرتا رہا۔ مسجد چھوڑنے ماموں جا میں گئے۔ پر ماموں کا تو کوئی اتنا پتا ہی نہیں، پھر اس کے دوست اور ابو ہی جا کر چھوڑ آئے۔ دیر ہو رہی تھی میں، معصوم ہاں جا کر ہی پڑھنی تھی۔“

”چھا ماشاء اللہ، وہ چلا گیا۔“ ایاز سپاٹ سا مسکرایا تھا۔

”تو اور کیا، تیرا کب تک انتظار کرتا۔“ تپا نے پہلو بدل کر کمر کی دوسری جانب ٹھنڈی ہوا لگوائی۔ ”اب اس طرح ہے تو اس سے جا کر مل بھی آ، اور انظار ہی بھی لے جا۔ اور ہاں روزانہ سحری انظار ہی تو ہی دے کر آئے گا۔“

عمر ایاز سننے ہی یک لخت سن سارا گیا۔ ”یعنی کہ دس دن۔“

میں سے جان چھڑا مسجد جا رہا تھا۔ آپا اتنا ہی اسے لینا لینا کر  
روٹی پار کر رہی تھیں۔  
”تھکے رہنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے، پریشان نہیں  
ہونا“ اکیلا نہیں ہو گا تو وہیں، ایاز سے کہہ دوں گی، وہ  
مسجد کے صحن میں سو جائے گا۔ دن میں بھی چکر لگاتا  
رہے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دیتا۔“ وہ  
فریاد واری سے سر ہلاتا رہا۔ اب کی بار بھی یہی سب  
کچھ ہوتا تھا۔ اس نے دس دن اعتکاف کیا۔ اور عمر ایاز  
نے سحر و انظار پہنچانے کے ساتھ ساتھ دس راتوں تک  
اس کا پرہیز کیا۔

\*\*\*

حیا اس سے بری طرح ناراض ہو چکی تھی۔ کتنی بار  
انظار پر بلایا مگر وہ آگے نہ دیا۔ ایسی بھی کیا ہے مولیٰ  
اتنا تو حسین بھی نہیں، نہ ہی کوئی بہت ٹھٹھ کی نوکری  
ہے جو غرور آگیا۔ اس کا دل ویسے بھی خدشوں سے بری  
طرح نیرو آنا تھا۔  
”جائے معاملہ کیا ہے، جو آکر نہیں دیتے۔“ عید  
سے دوسرے دن رخصتی طے تھی۔ اب بتائیں بہن  
بھائی آتے بھی ہیں یا نہیں۔ اور ابامیائے عجب ضد  
لگائی تھی۔ نکاح کرتے مل نہ لگایا تھا۔ اب رخصتی پر  
سلطان راہی بن کر بیٹھ گئے۔ اگر بارات میں بہن بھائی  
نہ آئے حیا نہیں ملے گی، آخر کو بے عزتی کر کے گئے  
تھے۔ آخری روزے والے دن اس نے عمر ایاز کو کل  
کر کے بتایا تھا۔

”۳۱ بہت ناراض ہیں۔ آپ بتا دیجئے“ آپ کے  
بہن بھائی آرہے ہیں یا نہیں۔“  
”ہاں ہاں ملی ڈیرے۔“ وہ لہک کر بولا تھا۔ ”میں نے  
سب کو راضی کر لیا ہے، آپ پریشان مت ہوں، آمیں  
گئے بھی اور کرشتہ رویے کی معافی بھی مانگیں گے۔“  
حیا کے چہرے پر حیا کی ساری سرخی دوڑ گئی۔ وہ ابھی  
بھی اپنی رسی کو آواز میں دس گھولے جا رہا تھا۔  
”رات کو چاند رات ہے، آپ تیار رہیے گا“  
شاہنگ پر لے چلوں گا۔“

پچھلے سال سے آپا کے بلو کو عجیب خبط چڑھا تھا۔  
سارا سال نماز نہیں پڑھی، قرآن پاک کبھی کھول کر نہ  
دیکھا، دو بجے چھوڑ کر تیسرے کی باری اب پھٹا رہا  
لے جاتے تھے۔

”بد بختوں اسلام سے خارج نہ ہو جانا۔“ لیکن جیسے  
ہی رمضان المبارک آتا۔ اعتکاف داغ میں سا جاتا۔  
بلو نے اپنے کسی دوست سے سنا تھا۔ اس نے بورڈ میں  
ٹاپ کیا ہے، پورے دس دن کے اعتکاف میں بیٹھ کر  
دو روزہ عافیت مانگی تھیں۔

بڑی آپا کے بچوں کی ذہانت پورے خاندان میں  
مشہور تھی۔ اسی سہرت کو ————— بلو اعتکاف

میں بیٹھ کر برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ ایک وجہ دس دن اہل  
ایا کی ڈانٹ پھٹکار اور دیگر کاموں سے خلاصی ملے گی،  
خدمت کے لیے ماموں، دل کھول کو آرام کروں گا اور  
پھر سارے خاندان میں عزت الگ۔ ہر کوئی اپنی دعاؤں  
کا پرچا تھا ملے آیا۔ سب اکٹھے ہو کر پھولوں کا ہار  
ڈال مسجد چھوڑنے گئے۔ چاند نکلنے پر پھولوں میں ملا کر  
لینے گئے۔ ماتھا چڑھا۔ نوٹ سمجھائے اچھی خاصی عیدی  
مل گئی تھی۔ اب یہ صرف اللہ جانے یا وہ خود ہیں اس  
نے کتنی عبادت کی تھی۔ کتنی پرہیزگاری دکھائی۔  
کیوں کہ دو دن پہلے ماموں سے میسے مانگ کر اپنا  
موبائل ٹھیک کروایا تھا اور پانچ سو کا نوڈ بھی کروا تا دیکھا  
گیا تھا۔

سحر و انظار کی ڈیوٹی سن کر عمر ایاز کا چہرہ سن ہوتے  
ہوتے منجمد ہو گیا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ آپ یہ  
کام مسجد بھائی کے ذمہ لگا دیں۔ کیوں کہ وہ بہت اچھی  
طرح سے اپنے مولوی نما، بہنوئی کو جانتا تھا۔ جتنا دن بھر  
محنت مشقت کے ساتھ نمازیں، قرآن پڑھتے تھے۔  
اتنی ہی مشکل سے اس وقت آنکھ کھلتی جب سحر ختم  
ہونے کے اعلانات شروع ہوتے۔ اکثر تو وہ ہوڑ کے  
وقت راتوں کا خلال کرتے پائے جاتے۔ وہ خود وقت پر  
روزہ رکھ لیں تو بڑی بات تھی۔ چہ جائیکہ بچے کو مسجد  
تک سحر و انظار پہنچائیں۔ اور بلو کا صرف سحر و انظار کا  
ہی مسئلہ نہیں تھا۔ جسے شوق و جذبے سے بچہ بہلورنا

فون بند ہونے کے بعد ادھر حیا شاپنگ کی لسٹ بنائے، آخری روزہ گزار رہی تھی ادھر عمر ایاز نے پلان بنایا کیا کیا، کھل کھل سے لے کر دیتا ہے، کیا کھانا ہے۔ چوڑی مندی تو اپنے ہاتھوں سے اس کے نازک ہاتھوں پر سجاوٹیں لگا۔ مصنفہ کیا کے توسط سے جو رومانوی جھلے یاد ہوئے تھے سب دہراتے ہوئے اسے شرم سے جھرجھری آگئی۔



تو قارئین چاند نظر آیا ہی چاہتا ہے۔ جہاں عمر ایاز کے من میں کل بوئے پھوٹنے کا وقت قریب تھا وہیں ہر طرف پناہ، بچے، شور شرابا، دھوم دھڑکا شروع۔ سب بہن بھائی بڑی تپا کے گھر ٹوٹ پڑے۔ مبارکی سنا سنی۔ بلو کا ہاتھ چوم، پیسے دے اپنی اپنی دعاؤں کا پوچھ رہے تھے۔ دوسرے نمبر والی پاپا البتہ ایک ہی بات پوچھ رہی تھیں۔

”بلو تجھے کسی کی زیارت ہوئی، البتہ اللہ رٹلی۔“  
بچے نے پہلے تو کھسیانوں کی طرح دیکھا پھر بڑی زوردار جھکی قریب بیٹھے ایاز ماموں کو بڑی۔

”کسی کی زیارت ہوئی یا نہ ہوئی البتہ حیا ماما کے ارد گرد میں نے ڈھیر بچے دیکھے۔“ عمر ایاز کا منہ خوش ہونے کے بجائے بنویں کے ڈھیر سے بھر گیا تھا۔ دل نے چچا کا کرکٹ کھانا۔

”مخموں! تم حیا کا رستہ چھوٹو گے تو وہ آئے گی۔“  
اما ڈھیر تو خود ہی لگ جائے گا۔ ”وہ سب کی نظر بھا کر وہاں سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ بڑی بھابھی کے منہ سے بڑی سے ”ہائے“ نکلی۔ سب ادھر ہی متوجہ ہوئے۔ بھائی جان کہہ رہے تھے۔

”بھئی اب مجھ میں ہمت نہیں۔ دیکھ کر لانا تھا۔“  
در اصل کل چھوٹی نے بڑی بھابھی کو بتایا تھا کہ جوتوں کی بڑی سستی سیل گئی ہے، میں نے عید اور ایاز کی رخصتی کے لیے دو جوڑے لے لیے۔ سستی سیل کا سنتے ہی بڑی بھابھی کی بڑی بڑی آنکھیں چھوٹے سے منہ پر ہیبت ناک حد تک پھیل گئیں۔ ہر چیز کی پروا کیے

بغیر۔ خرچے سے پیسے نکالے اور پہنچ گئیں اس سیل پر دھکم پیل میں جوتے کا سائز چھوٹا بڑا کیا تب تو محسوس نہ ہوا، سنبھل کر رکھ لیا تھا، لیکن اب نند کو دکھانے کے لیے آتے ہوئے ساتھ لے آئیں۔ انہیں تو شاید سستی کی بندھی پٹی میں اب بھی دکھائی نہ دیتا چھوٹی نند بول پڑی۔

”اگرے بھابھی، تمہارے پاؤں چھوٹے بڑے کب سے ہو گئے۔“ تب جا کر غور سے دیکھا تو بین ڈالنے شروع کر دیے۔

”بچہ تو عید ہے اب کیا کپڑوں، ڈکٹوں تو پرسوں بھی بند ہوں گی، ایاز کی بارات میں کیا نیکھ پاؤں جاؤں گی۔“  
بھائی جان تو اسی وقت ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہو گئے۔ ”دھیان سے لیتا تھا، بل۔“ سستی سن کر اندھی کیوں ہوئی تھیں۔ ”پھر عمر ایاز ہی تھا جو اس مشکل سے نکلتا ہے چارہ بار بار کہہ رہا تھا۔

”بھابھی سیل کی چیز واپس نہیں ہوتی۔“ مگر اس کی سننے کو نہ۔ بھابھی کی ایک سی رٹ ”تو جا کر اسے کہہ تو سہی، ان کا دوسرا جو نامی تو خراب ہوا ہو گا۔“  
”رٹ میں بھابھی وہ کھل نہیں گے۔“

”من میں گئے۔ تو جا کر تو دیکھ۔ اگر کم بخت نہ سنیں تو جوتے اٹھا اٹھا کر انہیں مارنے شروع کر دیتا۔ آپ ہی سنیں گے۔“

بھابھی نے اس کی ایک نہ سنی۔ جوتے تمہا کر اسے روانہ کیا۔ اب وہ کھل سیل والوں کے منہ لگ کر مزید وقت برباد کر رہی تھیں۔ ان کے پورے جوتے کے سائز کا دوسرا جو تا خرید اور پہلے والا سڑک پر پھینک گھر آ گیا۔ ابھی جوتے بھابھی کو دیے تھے۔ سب بہن بھائی اپنے گھر چائیکے تھے سوائے بڑی بھابھی جو جوتے کے انتظار میں تھیں، پکڑتے ہی چلتی ہیں اور مصنفہ بہتا کہے۔ وہ جانے کیوں شکاری کی طرح کھات لگائے بیٹھی تھیں۔ عمر ایاز کا بایک رکستہ ہی اس کی طرف دوڑی۔

”میری ایک بات سن۔“  
”جی۔“ اس نے بایک پر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔  
”بچہ اتنے بڑا ضروری کام ہے۔“



وہ نہ چاہتے ہوئے اتر اٹھا۔ ”کیا کام ہے اب۔“  
رات ہونے کو آگئی۔“

”اوہو بتاتی ہوں۔ ایاز یہ ان بیچ کیا بلا ہے۔؟“  
”آپ کو کیا کرتا ہے؟“ عمر ایاز کی ہنسنیں جیرانی سے  
سمٹیں۔ بھلا پڑھی لکھی باتوں سے اس بچہ کو کیا لیتا۔  
رہتا۔

”کرنا کرنا کیا ہے۔ یہ آج کل کی رانٹرز کے دماغ  
خراب ہو گئے ہیں، جاہلوں نے ان بیچ کر لکھتا سیکھ لیا،  
اب میری جیسی فلم سے لکھنے والیوں کی تو آگئی میں  
شامت تب ہی تو ان کی کہانیاں دھڑا دھڑکتی ہیں اور  
میری جیسی کی کوئی بڑھنے کی زحمت نہ کرے۔“

اب وہ بے چارہ کیا بتاتا کہ باقی تمہارا لکھا تو تم خود  
دوبارہ نہ پڑھ سکو بے چارے کو ادھر سے ادھر سے  
جس قسم کی بازاری زبان اور منظر نگاری کرتی  
تھیں، تو وہ خود ڈرتا تھا کہیں غلطی سے پبلش نہ  
ہو جائے، کیا ایسی تو ہے نہیں شہرت، ہضم کر لے،  
ڈھول لے کر بینک ہی نہ پہنچ جائے، لوگوں سے کیسے  
منہ چھپاؤں گا، یہ سب میری ہی ہمن نے لکھا ہے اور  
ادارے والوں کا الگ آفس سنسر ہو جائے گا۔ وہ  
بے چارہ تباہ کیا دھڑا سننے خاموشی سے سر ہلاتا رہا، لیکن ان  
کے اگلے جملوں نے ہلے سر کو ہلکا کر دیا۔

”میرے ذہن میں بہت ہی خوب صورت کہانی کا  
پلاٹ کھلبلا رہا ہے تو ذرا دھر بیٹھ کر ان بیچ تو کر دے، پھر  
ای میل ہو جائے گی۔ مجھے تو یہ عذاب لیپ ٹاپ چلانا  
بھی نہیں آتا، مین کوئی دباؤ، دب کوئی سا جاتا ہے اور  
ایسی ایسی شرمناک چیزیں کھل جاتی ہیں۔“ تباہ کو بیچ  
شرم آگئی۔ یقیناً ”کچھ زیادہ ہی شرمناک دیکھ لیا تھا۔  
”تباہ کسی اور وقت کر دوں گا، فی الحال وقت نہیں  
ہے۔ سوئیے بھی رات ہو گئی ہے۔“

”لے، تیرے کون سا بوی بچے دور ہے ہیں قاسم  
ہی ادھر ادھر پھرے گا۔ چل آ جا میرا بھائی۔ دیکھ ایاز  
اگر تو مجھے نہیں سکھائے گا تو پھر کس کے پاس جاؤں،  
ہو سکتا ہے ای میل دیکھ کر اگلے جلدی جلدی پڑھ  
لیں۔“

”لیکن میرا لیپ ٹاپ تو گھر پر ہے تباہ۔“ اس کے  
دماغ نے بروقت کام کیا تھا۔

”ہاں تو بلو والے رکھ دے۔“  
اسے زندگی میں پہلی بار بلوکے میٹرک کے نمبروں پر  
افسوس ہوا تھا۔ نہ اچھے نمبر لیتا نہ حکومت کی طرف  
سے بانٹے گئے لیپ ٹاپ میں سے اسے بھی ملتا۔

کیوں کہ معبد بھائی تو جس قدر نجوس تھے، تباہ بھی چار  
پیسے بچا کر بیٹھ اپنے جوڑے ہی بناتی تھیں۔ خیر  
مصنفہ تباہ کتنے ساتھ اس کا کمزور سا بازو اپنے جاندار  
ہاتھ میں دلوچ اور کھنٹی بلوکے کمرے میں لے گئیں۔  
کہانی لکھواتے منواتے اس بے چارے کے کتنے کھنٹے

بریلو کھڑے تھے۔ جانے کون کون سی فلمیں، انڈین  
ڈرامے، گانے کس کر کے کہانی گھڑی جا رہی تھی اور ہر  
جیلے پر اپنے آپ کو خود ہی داد دیتیں اور وہ حیرت سے  
دیکھ رہا تھا۔ یہ سب خرافات میری ہمن کے منہ سے  
اہل رہی ہے، ادھر بار بار حیا کے مسج آرہے تھے۔

”آخر بتا کیوں نہیں دیتے، ناراض کیوں ہیں۔“ حیا  
کو آج بیچ بیچ تشویش تھی۔ کیوں کے اس کے لبا کی  
طبیعت کچھ خراب تھی۔ رمضان نے تھکا دیا تھا۔ اوپر  
سے کل عید تھی۔ صبح کتنا چلنا تھا اور پھر دو دن بعد  
بٹی کی رخصتی بھی تھی۔ ان کی تھکاوٹ عمر ایاز کو عاتبانہ  
گالیاں دے دے کر اتر رہی تھی۔ آدھی رات کے بعد  
وہ قاسم ہوا تھا، وہ بھی تب جب بڑی تباہ نے مصنفہ تباہ کو  
اچھا خاصا ڈانٹا۔

”اے کیا تو یوں ہی شذ منڈ بیٹھی رہے گی، کل عید  
ہے۔ کوئی جوڑی، کوئی منڈی، کچھ نہیں کرنا چاہیے، کھلی  
ہے کہانیاں گھڑنے، لکھنی لگاتی تو ہیں نہیں۔“ اس  
عزت افزائی پر تو شاید انہیں ذرا برابر اثر نہ ہوتا، ایسی تو  
دن میں کئی بار ہوتی تھی، مگر تباہ کا اگلا خیر سے بھر اجملہ  
انہیں کھسا گیا۔

”کیسے تیرا ارادہ عید گاہ کے باہر بیٹھنے کا تو نہیں ہے،  
جو یوں حال بیکھرے بیٹھی ہے۔“ وہ بچے جھاڑتی ہوئی  
ایک فٹ انہیں۔  
”مانگیں میرے دشمن۔“ اشارہ بڑی تباہ کی طرف

تھا۔ ”اللہ رکھے بڑی رقم ہے میرے پاس“ پارلر والی نے تین بجے کا وقت دے رکھا ہے وہ تو میں ٹائم گزارنے کے لیے ایاز کو لیے بیٹھی تھی۔ ”حیرت سے آنکھیں منہ کھولے عمر ایاز کی دونوں چیزیں تپاکی چبھنے بند کیں۔

”چل اٹھ“ مجھے ذرا پارلر اتار کے آ۔ پھر کرتا رہ جو پڑھ کرنا ہے۔“

”اب کیا خاک کرنا ہے“ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ اللہ کرے پارلر والی غلط کیسے کل اکاڑے اور منہ پر جھالے پڑ جائیں پھر فوراً ہی رخصتی ایٹ ہونے کا خیال گزارا تو توبہ بھی کر ڈالی ورنہ یہ بسن تو ایسی تھی چاہے کتنیوں کی طرح دہائیاں ڈال ڈال کر پاتی بارات رکوا دیتی۔

اس نے حیا کی طرف جانے کا ارادہ عید کی نماز ادا کرنے پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ اسے بستر پر لیٹا تھا۔ نیند آنکھوں سے دور کہیں حیا کے گھر جاسوگی تھی۔ ہر کوٹ کے ساتھ جملہ بھی بدل جاتا کہ وہ کیسے اسے منائے گا، عید مبارک کے گا، اسے عید کی دیتے کیسے تاثرات دیتا ہوں گے اور وہ شرابی بل کھاتی تھی ساری لگ گی۔ ان ہی سوچوں میں غلطی صبح ہو گئی تھی۔ گھر میں عید کی گھما گھمی تھی۔ وہ بہت اچھا سا ستار ہوا تھا۔ نماز ادا کرنے کو نکل ہی رہا تھا جب حیا کی کل آئی۔

”عمر ایاز، رمضان کی تھکاوٹ کی وجہ سے ایسا طبیعت بہت ہلکا ہے، تمہیں آپ سے ایک ضروری مدد چاہیے، کیا آپ وہ کر سکتے ہیں یا آپ کی خاموشی کو اذکار سمجھوں۔“

روزے اور وہ بھی مگری کے سب کو ہی شدید کمزوری ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ہر بار ایسا ہی تھکاوٹ کا ذکر کرتی اور کل توبہ بھی بتایا تھا کہ آواز بہت بیٹھ گئی ہے، ذرا سا بولنے پر گلا درد کر رہا ہے، اشاروں سے کام لے رہے ہیں اس نے جب یہی سوچا تھا۔ مٹھنڈے شربت، اہلی انار دانے کی چٹنیوں نے شکایت پیدا کر دی۔ بھلا اپنی مٹھنڈی کھینچ کر چرس نہ کھاتے۔

”بتائیں“ آئیں گے یا نہیں۔ ”حیا کی کھنکھاتی فرمائش نے سوچوں کا کارخانہ توڑا۔

”کیوں نہیں آئیں گے۔ بس میں آیا کہ آیا۔ اور ہلے وہ موقع تازتے ہی فوراً بولا۔ آپ خفاست ہوا کریں، بھلے میری جان کمزور سہی مگر اس میں بھی ایک دل ہے جو آپ کا نام لے لے کے دھڑکتا ہے۔ خدا را مصروفیات کی وجہ سے کوئی ہو جاتی ہے ورنہ میں تو سر کے بل۔“ وہ دُور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”چلیں ٹھیک ہے عمر ایاز۔ ہمیں آپ کی محبت کا یقین آیا، مگر خدا کے واسطے سر کے بل چلنے والا کرب آپ بعد میں دکھاتے رہیے گا، کافی الملل ابابور اضی کرنا ہے مہن کا کام کر دیں۔“

”جی، جی بندہ حاضر ہے۔“ اور پھر بندہ حاضری لکوانے اندھا بندہ بانیگہ دوڑا اس کے گھر جا کر ہی رکھا تھا۔ ایاز مہن میں پہنچی چارپائی پر اٹھنے لپٹے تھے۔ بیگم کندھے کی بالش کر رہی تھیں۔ عمر ایاز کو دیکھتے ہی کھل گئے۔ اپنی بیٹی آواز میں بولے۔

”بیگم مجھے پورا البین تھا میرا بچہ ضرور آئے گا، آخر پورے رمضان میں نے لوگوں کو نیند سے جگا جگا کر روزے رکھوائے ہیں اللہ محنت ضائع نہیں کرتا۔“ وہ سلام کر کے بیٹھے لگا تھا۔ اپنے فوراً لگا۔

”اوہ بھائی! اب بیٹھے کا وقت نہیں ہے بس میرے ساتھ ذرا سا کام تم بھی بنو لو۔“

”ذرا میرے ساتھ مسجد چلے چلو فطرے کی پرچیاں کٹوانے۔“ ایاز کی ذرا کی ذرا آنکھیں پھیلیں، اسے کچھ خاص سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اتنے میں انہوں نے حیا کو کھٹی آواز میں پکارا۔

”حیا! اندر سے ذرا پرچیاں تولے کر آتے فطرے کے پیسے جمع کرنے آج میرا بچہ جائے گا۔ اس کی اندر کی سانس اندر رہا ہر کی باہر ہو گئی۔ حیا اندر سے فطرانے کی پرچیاں لے آئی۔ اور بڑا الجھا کر بولی تھی۔

”ابا کو منانے کا یہی طریقہ ہے، پلیز، میری خاطر۔“ اس کے اگلے دانت جڑ گئے۔ ناک پھولنے پھٹنے لگی۔ اور دل دہائیاں دے رہا تھا۔

”اف اف شلوی“ لیکن جہاں بسن بھائیوں کو منانے کے لیے اتنی خواری سہی دہاں ایک اباجی اور سہی۔“